

شیخ محمد منصور المحبوب

چیف جسٹس لیڈیا سے ایک ملاقات

لیڈیا افریقہ کا مشہور اسلامی ملک ہے۔ جو مصر اور مراکش کے درمیان واقع ہے، یہاں کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ محمد منصور المحبوب کا نام تو میں نے بار بار سنا تھا، لیکن ان سے پہلی ملاقات ۱۰ ازیقہ ۱۴۳۸ھ کی شام کو چک لالہ ایئر پورٹ کے دی آئی پی روم میں ہوئی۔ یہ راولپنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا پہلا دن تھا، بیشتر ملکی و غیر ملکی مندوبین پہنچ چکے تھے، اور سہ پہر کو تین بجے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے وسیع لان میں کانفرنس کے افتتاح کی رسمی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم جو اپنی علالت کی بناء پر ابھی تک پنڈی نہیں پہنچ سکے تھے، شام کو سوا چار بجے کے طیارے سے تشریف لایا۔ اے تھے، میں وقت سے کچھ پہلے چک لالہ کے ہوائی اڈے پہنچ گیا، اسی طیارے سے انڈونیشیا کے ایک مندوب پروفیسر ابراہیم حسن بھی تشریف لارہے تھے۔

ٹھیک سوا چار بجے پی آئی اے کا ٹرائیڈنٹ طیارہ زمین پر اترا اور اس میں سے حضرت والد صاحب مدظلہم اور پروفیسر ابراہیم حسن کے علاوہ مجھے ایک اور پُرکشش شخصیت اترتی نظر آئی۔ دراز قد، بھرا ہوا جسم، معصوم اور باوقار چہرہ، سریر خوبصورت عمامہ کیساتھ سُرخ ٹوپی، اور گردن سے ٹخنوں تک اوننی جبہ پہنے ہوئے۔ جب وہ قریب آئے تو میں استقبال کیلئے آگے بڑھا انہوں نے مسکرا کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ”منصور المحبوب من لیڈیا“ اس سے قبل کانفرنس کے منتظمین نے مجھے یہ بتلایا تھا کہ شیخ منصور المحبوب کسی عذر کی وجہ سے

تشریف نہیں لارہے۔ اس لئے اچانک یہ نام سن کر مجھے حیرت کے ساتھ بڑی مسترت ہوئی۔ دی آئی پی روم میں رسمی مراسلے طے کرنے کے بعد جب ہم ہوٹل جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو انہوں نے بتایا کہ مسلسل سفر کی بنا پر وہ تین راتوں سے سو نہیں سکے اور سخت تھکن کی وجہ سے آج کی مجلس میں شریک ہونا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ہوٹل انٹرکانٹیننٹل پہنچ کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے، اور صبح تک کسی پروگرام میں شریک نہیں ہوئے۔

اگلی صبح جب میں کانفرنس ہال جانے کیلئے اپنے کمرے سے نیچے اترتا تو وہ لاہری میں کھڑے تھے میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا :

فرمائیے رات کیسی گزری۔؟

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”رات بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ اب میں بالکل تازہ دم ہوں۔“

اس کے بعد ہم باتیں کرتے ہوئے کانفرنس ہال تک آ گئے۔ محب محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر مابنامہ الحق (اکوڑہ خشک) بھی موجود تھے۔ ایک بجے کے قریب اجلاس سے فارغ ہو کر ہم دونوں شیخ محبت کے کمرے میں چلے گئے، کافی دیر تک ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر ہم نے ”البلاغ“ اور ”الحق“ کے مختصر تعارف کے بعد ان سے ایک انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ اس پر انہوں نے کہا :

”کانفرنس کی مصروفیات تو آپ کے سامنے ہیں، آپ ایسا کریں کہ کسی وقت سوالات لکھ کر مجھے دیدیں، مجھے جس وقت بھی ہمت ملے گی، ان کا تحریری جواب پیش کر دوں گا۔“

چنانچہ اسی روز شام کو میں نے کچھ سوالات لکھ کر انہیں پہنچا دیئے۔ لیکن اس کے بعد کے پروگرام اس قدر مسلسل تھے کہ جب تک میں راولپنڈی میں رہا، ان سے بس اتنے باتے علیک سلیک ہوتی رہی اور کسی تفصیلی ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔

پھر ۱۶ ذیقعدہ کو جب میں لاہور پہنچا تو جامعہ اشرفیہ کے ایک جلسے میں ان سے پھر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا :

”میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے سوالات کا جواب اب تک نہیں لکھ سکا۔ کل دس بجے کے قریب میں کراچی واپس جا رہا ہوں، آپ اگر صبح ہوٹل انٹرکانٹیننٹل میں مجھے مل لیں تو بڑا اچھا ہو۔“

میں نے صبح آنے کا وعدہ کر لیا، اور جب اگلی صبح میں ہوٹل پہنچا تو ان کے ہوائی اڈے کیلئے

روانہ ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے سوالات کا پرچہ نکالا، اور مسکرا کر کہنے لگے: ”میں اب بھی جوابات لکھ نہیں سکا، اب زبانی ہی کچھ باتیں ہو جائیں۔“ اور اس طرح گفتگو شروع ہو گئی، میں نے پوچھا:

”یسپا میں عدالت اور قضا کے نظام کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔“

”یسپا میں دو قسم کی عدالتیں ہوتی ہیں۔“ شیخ سنے اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

ایک شرعی عدالتیں جن میں دینی امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اور دوسری مدنی (سول) عدالتیں جن میں حقوق شہریت سے متعلق مقدمات کی سماعت ہوتی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔ ابتدائی عدالتیں جن کی طرف ہر مقدمے میں ابتداء رجوع کیا جاتا ہے۔ اور مرافعہ (WRIT PETITION) کی عدالتیں جن میں ابتدائی عدالت کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ پھر ان تمام عدالتوں کے اوپر ایک محکمہ علیا (سپریم کورٹ) ہے جس میں شرعی اور مدنی دونوں قسم کے تنازعات کا تصفیہ ہوتا ہے۔ اس محکمہ علیا کا کام یہ ہے کہ وہ عدالتوں کے مرافعہ کے فیصلوں پر نظر ثانی کرتا ہے، انتخابات کے سلسلے میں جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اسی عدالت کے سپرد ہوتے ہیں۔ نیز دستوری تنازعات کا فیصلہ بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ یہ عدالت اپنے مالی اور انتظامی امور میں ایک آزاد ادارہ ہے جو ایک جنرل باڈی کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔“

”قاضیوں کے عزل و نصب وغیرہ کا اختیار کس کو ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”قاضیوں کے عزل و نصب اور ترقی و تنزل وغیرہ کے جملہ امور ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہیں جو ”مجلس اعلیٰ للقضاء“ (SUPREME JUDICIAL COUNCIL) کہلاتی ہے۔ محکمہ علیا کا رئیس القضاء (سپریم کورٹ کا چیف جسٹس) اس جماعت کا صدر ہوتا ہے، اور ملک کے بڑے بڑے ماہرین قانون اس کے رکن ہیں۔ یہ تمام قاضی خواہ کسی قسم یا کسی درجے کی عدالت سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فیصلوں میں قطعی طور پر آزاد ہوتے ہیں، اور قانون کے سوا ان پر کسی کی بالادستی نہیں ہوتی۔“

شیخ محبوب یہاں تک پہنچ کر رک گئے تو میں نے پوچھا:

”یسپا میں قوانین کا بنیادی ماخذ کیا ہے۔“

فرمانے لگے۔ ”بعض بزرگی قوانین نظر ثانی کے محتاج ہو سکتے ہیں، لیکن یسپا میں بنیادی طور پر اسلامی شریعت ہی کو ماخذ قانون قرار دیا گیا ہے۔“

”ساتھ الشیخ!“ میں نے کہا: ”آجکل پوری دنیا جرائم و مظالم کے رندا فزوں اٹھانے سے بری طرح تنگ آئی ہوئی ہے، بعض لوگ کہتے تھے کہ جرائم کا بڑا سبب انلاس ہوتا ہے لیکن آج دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ قانونی مشنریوں کی کمی یا کمزوری کو جرائم کے اٹھانے کا سبب قرار دیا جاسکتا تھا۔ مگر ہماری آنکھوں کے سامنے جتنا اضافہ قانونی مشنریوں میں ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جرائم بڑھ جاتے ہیں، آخر اسکی وجہ کیا ہے؟“

اس مرض کا کوئی علاج بھی ممکن ہے۔“ میرے اس سوال سے ان کے لبوں پر ایک مغموم مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے، اس کے بعد انہوں نے رک رک کر بولنا شروع کیا:

”اس سوال کا جواب بڑا طویل ہے۔ تقی صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت انسانیت کی باگ ڈور ہے، وہ انسان اور خاص طور سے مجرم کی نفسیات کو نہیں سمجھ سکے۔ انکی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ذہن کی صحیح تربیت کے بغیر صرف قانونی جکڑ بندیلوں سے جرائم کا انسداد کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ قطعی طور پر غیر فطری ہے۔ اور اس سے اصلاح احوال کی توقع رکھنا خود فیری کے سوا کچھ نہیں۔“

یہاں پہنچ کر اچانک ان کے لبھے میں ہلاکی روانی آگئی، وہ قدم سے جوش کے ساتھ کہنے لگے:

”موجودہ دنیا نے ترمادہ اور نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے، اور اسکی تمام تر سرگرمیاں اسی پھیتے کے گرد گھوم رہی ہیں، انسان کو خوب اچھی طرح یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ تیری زندگی کا مقصد ہائے مقصود مادی منافع کا حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے، اس کے ذہن سے یہ بات محو کر دی گئی ہے۔ کہ اس دنیا میں چند سال گزارنے کے بعد اسے کہیں اور بھی جانا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی چند روزہ زندگی کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہے، جب اسے جائز طریقوں سے اس زندگی کا عیش میسر نہیں آتا تو وہ اپنے آپ کو محروم سمجھتا ہے۔ بس یہی احساس محرومی ہے جو اسے جرم اور گناہ کی طرف سے جاتا ہے۔ پھر آپ بڑے قانون کے ڈنڈے کے بل پر اسے ارتکاب جرم سے نہیں روک سکتے تنہائی اور تارکی میں اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا، اس لئے وہ بڑی آسانی سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ پھر جب اسکی خواہشات اور جہالتیں بڑھتی ہیں تو آبادی اور اجالے میں بھی وہ کھلے بندوں قانون سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اسکی نظر میں محرومی اور اسیری دونوں برابر ہیں۔“

”پھر آخر اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے۔؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر ہم رجعت پسندی کے ہل طعنے سے ڈرنا چھوڑ دیں۔ تو اس کا بڑا اچھا حل ہمارے پاس

موجود ہے۔ اور وہ ہیں اسلامی تعلیمات۔ انہوں نے کہا۔

”اسلام کی وہ کوئی تعلیمات ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ جو اس مشکل کا حل پیش کرتی ہیں۔؟“

انہوں نے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا،

”دراصل اسلام نے اول تو اس بات کی کوشش کی ہے کہ جرائم خود بخود کم سے کم مسرود ہوں اس کے لئے اس نے قانونی مشنریوں کی افراط کرنے سے زیادہ خوفِ خدا اور عقیدۂ آخرت پر زور دیا ہے۔ سب سے پہلے انسانی ذہن کو اس رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ نہ سمجھے، پیٹ اور مادے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے بلکہ عمل صالح اور آخرت کی بہبود کو اپنا مقصد حیات قرار دیکر اسی منزل کی جستجو کرے، غور فرمائیے کہ جب ایک شخص اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے، اور اس کے بعد ایک ابدی زندگی آنے والی ہے تو اگر اس دنیا میں اسے کچھ تنگی ترشی بھی برداشت کرنی پڑے تب بھی وہ اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے اپنی آخرت خراب نہیں کرے گا، اور یہ تنگی ترشی اس کے دل میں وہ عرومی کا احساس پیدا نہیں کرے گی جو میرے نزدیک جرائم کی جڑ ہے۔ لہذا اسلام نے سب سے پہلے تو ایسی ذہنیت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے جو مادی اغراض کے حصول کی بجائے آخرت کی بہبود کو اپنا مقصد قرار دے۔ پھر مجموعی طور سے ماحول ایسا پیدا کیا ہے جس میں جرائم کے امکانات کم سے کم ہو جائیں، لیکن ان حفاظتی تدابیر کے بعد بھی اگر کوئی بد باطن شخص جرم سے باز نہ رہ سکے تو پھر اس کے ساتھ کسی رحم کے سلوک کو اس نے گوارا نہیں کیا۔ وہ معاشرے کا مٹا ہوا عنصر ہے جسے کاٹنے کیلئے ایسی حدود شرعیہ نافذ کی گئی ہیں، جو ایک مرتبہ جاری ہو جائیں تو ساہا سال تک لوگوں کیلئے عبرت کا سامان بن جائیں۔“

”لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حدود شرعیہ اسلام کے ابتدائی دور کیساتھ خاص تھیں، اب ہمارے لئے ان کی پابندی ضروری نہیں رہی۔؟“ میں بیچ میں بول اٹھا۔

”ایسا کون کہتا ہے؟“ انہوں نے قدرے تعجب سے کہا۔ ”قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک زمانے کیلئے نازل نہیں ہوئے تھے، ان کے مخاطب ہر دور اور ہر زمانے کے لوگ ہیں۔ لہذا قیام قیامت تک ہمارے لئے ان کے تمام تشریعی احکام کی پابندی ضروری ہے اور ان میں شرعی حدود بھی داخل ہیں۔“

”مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ سنت سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے۔“

بلکہ ہر زمانے کے مسلمانوں کی سنت بھی اس میں شامل ہے، لہذا اگر کسی زمانے کے مسلمان قانونی احکام کے سلسلے میں کوئی نیا طرز عمل اختیار کریں تو وہ بھی سنت ہے۔ خواہ وہ پہلے مسلمانوں کی سنت کے خلاف ہو۔ میں نے کہا۔

"میں پہلی بار آپ سے یہ عجیب و غریب بات سُن رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں اور اسی کو پوری امت کا عقیدہ سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کا بیان فرمودہ طریقہ زندگی ہمارے دین و دنیا دونوں کے لئے صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔ اور یہ طریقہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں قابل عمل بلکہ واجب العمل ہے، ہم اس طریقے کی بجائے اپنی طرف سے گھڑ کر جو طریقہ بھی اختیار کریں گے وہ ہمیں ناکامی کی طرف لے جائے گا۔"

شیخ محبوب کی اس بات پر مجھے وہ حضرات یاد آ گئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید کے بغیر مسلمان کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، اس لئے میں نے ایک اور سوال کیا کہ:

"مغربی تہذیب کے رد و قبول کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک مغربی تہذیب کے معاملے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط، بیدار مغزی اور سوچ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی جو چیزیں مفید اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں انہیں ضرور اختیار کیجئے، بلکہ ان میں سے بیشتر چیزیں وہ ہیں جو میرے خیال میں اسلام ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً مذہب تحقیق و جستجو، جہد و عمل کا شوق وغیرہ۔ انہی چیزوں کے نتیجے میں انہوں نے جو مفید آلات و صنعتیں ایجاد کی ہیں ان سے ضرور نفع اٹھانا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کا ایک نہایت تاریک رخ بھی ہے، فحاشی و عریانی، رقص و سرود، تصنع اور تکلف، مادہ پرستی یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو مغربی تہذیب کے بدترین مظاہر ہیں۔ اور انہوں نے انسانیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے، افسوس ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ اول الذکر چیزوں میں تو مغرب کی مطلق تقلید نہیں کرتے، اور مؤخر الذکر معاملات میں ان سے بھی آگے بڑھ جانے کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکر سلیم عطا فرمائے۔"

"آمین" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور اتنے میں یسویا کے سفارت خانے کے لوگ شیخ محبوب کیلئے گاڑی لے کر آ گئے۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملانے، معافۃ کیا اور "فی امان اللہ" کہہ کر رخصت ہو گئے۔

